اقبال اور تیسری دنیا

کوثر نیازی

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کی
راہنمائی میں تیسری دُنیا کے موضوع پر مولانا
کوثر نیازی کا اظہار خیال اس لحاظ سے
زبردست اہمیت رکھتا ہے کہ اہلِ علم و دانش
نے اس موضوع پر اِس انداز میں پہلے کبھی قلم
نہیں اُٹھایا۔ 'اقبال اور تیسری دُنیا' اِس
بات کا روشن ثبوت ہے کہ فکرِ اقبال کی
پرواز افق در افق ہے اور مولانا کوثر نیازی
نے عصرِ حاضر کے مسائل کے بارے میں جب کہ
امیر اور غریب قوموں کے درمیان فرق
انتہائی واضح ہو چکا ہے فکرِ اقبال سے اُس
حل کو پیش کیا ہے جس میں تیسری دُنیا
کی غریب قوموں کی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔

مولانا کوثر نیازی کی تحقیقی کاوش 'اقبال
اور تیسری دنیا' پاکستان کے عظیم فلسفی شاعر
اور تیسری دُنیا کے عظیم مفکّر علامہ اقبالؒ کے
حضور خراجِ عقیدت کا درجہ رکھتی ہے اور ڈاکٹر
جاوید اقبال کی رائے میں مولانا کوثر نیازی
نے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے فکرِ اقبال

اِقبال اور تیسری دُنیا

کوثر نیازی

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جملہ حقوق محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز۔ لاہور

طبع اوّل : جنوری ۱۹۷۷ء

قیمت : پانچ روپے

تعداد : تین ہزار

مقامِ اشاعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

مندرجات

ابتدائیہ

اظہارِ رائے — جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال اور تیسری دُنیا

ابتدائیہ

یہ مختصر سی تالیف اصل میں میری ایک تقریر کا متن ہے جو میں نے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام اسلام آباد میں منعقد ہونے والی یومِ اقبال کی تقریب میں کی تھی۔ اربابِ علم و دانش نے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں کو اپنی ذہنی کاوشوں کا موضوع بنایا ہے اور اس سلسلے میں کئی ایک اچھی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، لیکن کلامِ اقبال پر تیسری دنیا اور اس کے مسائل کی روشنی میں غور کرنے کی کوشش شاید ایک نیا خیال ہے۔ خود تیسری دنیا کی اصطلاح ایک بالکل نئی اصطلاح ہے اور اس کے عوامل اور مضمرات بھی

کلیتہً نئے ہیں۔ آج کل اس موضوع پر بہت بحث و تمحیص ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ توقع کرنا بے جا نہیں کہ میرے یہ خیالات اس موضوع پر دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

یہ تالیف چونکہ اصلاً ایک خطاب ہے۔ اس لیے اس میں تالیف و تصنیف کا انداز تلاش کرنا مناسب نہ ہو گا۔ البتہ اس میں چند ایسے نکات ضرور زیرِ بحث لائے گئے ہیں جو نئے بھی ہیں اور اہم بھی اور اس لحاظ سے یہ فکرِ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے راہنما اصولوں کا کام دے سکیں گے۔

کوثر نیازی

۲۱۔ اگست ۱۹۷۶ء

اظہارِ رائے

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال

"اقبال اور تیسری دُنیا" کے موضوع پر مولانا کوثر نیازی نے اپنے خطاب میں فکرِ اقبال کی وسعت کا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔ اقبال کے اپنے عہد میں دو دُنیاؤں کا تصوّر موجُود تھا اور اس سلسلہ میں مغرب اور مشرق کی اصطلاحیں رائج تھیں۔ مغرب ترقی یافتہ اور سیاسی، اقتصادی، صنعتی و تمدّنی اعتبار سے غالب تھا، مشرق پسماندہ اور مغلوب۔ اقبال کا تعلق چونکہ مشرق سے تھا، اس لیے مشرق کی پسماندگی اور مغلوبیّت ان کی تمام تر توجہ کا مرکز بنی۔ بہرحال اقبال شاعرِ مشرق کہلانے کے باوجود ایک آفاقی شاعر و مفکّر تھے اور اُن کا پیغام ساری انسانیّت کے لیے ہے، گو ہمیں یہ بات ہرگز نہ

بھولنی چاہیئے کہ اقبال کی آفاقیت اور انسان دوستی کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہیں کیوں کہ وہ بنیادی طور پر اسلامی شاعر و مفکر تھے اور دُنیائے اسلام پسماندہ یا ترقی پذیر مشرق ہی کا حصّہ ہے۔

اقبال کی وفات اور دُوسری عالمگیر جنگ کے بعد سوویٹ روس اور اس کے ہمنوا ممالک نے ترقی کی دوڑ میں مغرب کی صنعتی اور تکنالوجیکل برتری کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی اور تب سے مشرق کی اصطلاح خصوصاً اُن کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ لیکن یہ اصطلاح بجائے خود جامع تھی اور نہ ہے۔ کیوں کہ سُرخ چین نے سوویٹ روس سے نظریاتی تعلقات توڑنے کے بعد اپنے آپ کو نہ صرف مشرق کے اس محدود تصوّر سے الگ رکھا بلکہ مغربی استعمار یا سامراج کے دوش بدوش ایک نئے استعمار کی نشان دہی کی جسے سوشل استعمار کا نام دیا گیا۔ علاوہ اس کے جاپان اور آسٹریلیا جو جغرافیائی اعتبار سے مشرق کا حصّہ تھے، ترقی یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ مشرق میں مغرب کا پرتو تصوّر کیے گئے، اور

آج تک مشرق میں مغرب کے جزیرے سمجھے جاتے ہیں۔

بہرکیف جب سے مشرق کی اصطلاح سوویٹ روس اور اس کے حامی ممالک کے لیے مختص ہوئی ہے، پسماندہ ممالک کو تیسری یا ترقی پذیر دنیا میں دھکیل دیا گیا ہے اور اس کا دائرہ وسیع کر کے اس میں صرف ایشیا کے ممالک ہی نہیں بلکہ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ ان پسماندہ یا ترقی پذیر ممالک میں سے اکثر و بیشتر سیاسی طور پر تو آزاد ہیں مگر اپنی پسماندگی کے سبب ابھی تک سرمایہ دارانہ یا سوشل استعمار کی زد میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن میں سے بعض مُلک، بالخصوص تیل پیدا کرنے والے ممالک میں نئی تحریکوں نے جنم لیا ہے اور وہ آج تکنالوجیکل آزادی، معاشی خود مختاری اور انصاف کی بنیادوں پر مبنی کسی نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن کی اِس کشمکش کو شمال و جنوب کی تفاوت بھی کہتے ہیں۔

اقبال اپنی تمام عمر اسلامی طرزِ حیات کے علمبردار

رہے۔ اگرچہ وہ نئے تصوّرات کو اپنانے کے مخالف نہ تھے، انھوں نے مُسلمانوں کو ہمیشہ یہ تلقین کی کہ نئے تصوّرات قبول کرتے وقت اُن کا زاویۂ نگاہ مقلّدانہ نہیں بلکہ نقّادانہ ہونا چاہیئے۔ یعنی وہ مغرب یا مشرق کی اندھا دھند تقلید مت کریں بلکہ نئے تصوّرات کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اگر اُن کی اسلامی نظریات کے ساتھ تطبیق ہوتی ہو تو اُنھیں قبول کریں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو انھیں رد کر دینے میں تامّل نہ کریں۔ یہ ہر اقبال شناس کو معلوم ہے کہ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی نظام دونوں کو حیاتِ انسانی کے لیے ناکافی اور مضر سمجھتے ہُوئے رد کر دیا تھا۔

"جاوید نامہ" کے باب فلک عطارد میں جمال الدین افغانی کے منھ سے کہلواتے ہیں ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں برد جاں را ز تن، ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

اقبال کے فکر کی اساس قرآن ہے اور ان کی تمام تر کوشش تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے مُسلمانوں کو قرآنی تعلیمات کی ضیاء کی طرف لانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا نغمہ سمجھتے تھے جو دورِ حاضر کی مضراب سے بے نیاز ہے یا ایک ایسے شاعر کی صدا تصوّر کرتے تھے جس کا دور مستقبل میں شروع ہو گا ؎

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعرے فردا ستم

اقبال کی وفات سے لے کر اب تک ہمارا پسماندہ ملک بلکہ پسماندہ دُنیا، کئی مراحل سے گزرے ہیں۔

نوآبادیاتی سلطنتوں کے کھنڈرات پر کئی نئی پسماندہ آزاد قومی ریاستیں قائم ہوئیں جو ترقی کی تحصیل کے لیے کوشاں ہیں، مگر دو عالمی جنگوں اور نئے تصوّرات پر اقبال کے بے لاگ تبصرے کے باوجود ہمارے پسماندہ ملک اور پسماندہ دُنیا میں یہی سمجھا جاتا رہا کہ انسانی ترقی کا راز تکنالوجی، دولت اور قوّت کے نئے نظریات کو اپنانے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پس تکنالوجی، دولت اور قوّت کے نئے تصوّرات نے تیسری دُنیا کی نگاہوں کو خیرہ کیا اور ان تصوّرات کی عالمی تشہیر کے باعث پسماندہ معاشروں نے اپنے مستقبل کی شبیہہ عصرِ حاضر کے مغربی یا مشرقی ترقی یافتہ معاشروں کی تصویر کے مطابق ترتیب دی۔ تقلید، نقّالی اور برگشتگی کے دور میں یہ یقین کر لیا گیا کہ انسانی ترقی کی تحصیل کے لیے صرف دو ہی رستے ہیں، یعنی سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد تیل کے بحران، عالمی افراطِ زر

آبادی کے بلا قید پھیلاؤ اور اکیسویں صدی کے اختتام سے پیشتر دنیا کے ذخائرِ قوت اور وسائلِ خوراک کے خاتمہ کے احتمال نے عالم بھر کے آزاد خیال مفکّروں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ترقی کی تحصیل کے لیے مروّجہ طریق، یعنی سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام، انسان کے اپنی تقدیر پر قادر ہونے کے رستہ میں حائل ہیں۔ اِن مفکّروں کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی نظام دونوں عالمی طور پر پسماندگی کو دُور کرنے میں ناکامیاب رہے ہیں۔ بلکہ ان کی قوّت میں مسلسل اضافے کے لیے باہمی رقابت کے سبب آج دنیا کی سیاسیات انسانی ترقی کی سیاسیات نہیں، قوّت و اقتدار کی سیاسیات ہیں۔ لہٰذا دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں اب کسی کے پاس بھی پیش کرنے کے لیے ایسی کوئی معاشی تنظیم نہیں رہی جو انسان میں بحیثیت انسان اپنے مستقبل کو بہتر بنا سکنے کے لیے نیا عزم پیدا کر دے۔ ان مفکّروں کی رائے میں سب انسان اس لحاظ سے پسماندہ ہیں کہ اپنی اپنی بقا کے لیے انھیں معاشی طور پر ایک

دُوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اکیسویں صدی میں انسانیّت کو تباہی سے بچانے کے لیے یا انسانیّت کی بقا کی خاطر ضروری ہے کہ ہر ملک اپنی آبادی کی منصوبہ بندی اپنے وسائل کے مطابق کرے اور اپنے وسائل کو پُورے طور پر استعمال میں لائے۔ انسان بنیادی طور پر منفرد اور تخلیقی ہے۔ اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ تغیّر سے پیدا شدہ نئے مسائل حل کر سکتا ہے اور اُس کی صحیح تربیّت ایجاد و اختراع کا سبب بنتی ہے جس کے ذریعے ہر قسم کے بحران پر قابُو پایا جا سکتا ہے۔ پس اِن مفکّروں کے نزدیک دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک باہم مل کر ہی منفی عالمی اقتصادی قوّتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اکیسویں صدی میں صرف انسانیّت کی وحدت اور یک جہتی ہی اس کی معاشی بقا کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ گو آزاد خیال مفکّر اکیسویں صدی میں دنیا کی معاشی تباہی اور ابتری کے خدشہ کے پیشِ نظر انسانیّت کے اتحاد کے اصول کو

تسلیم کرانے کے درپے ہیں، لیکن ترقی یافتہ یا متموّل ممالک کی سیاسی قیادت اِس اصول کو تسلیم کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔

اقبال کی بصیرت کا کمال ہے کہ انھوں نے آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر مُسلم ممالک کو بالخصوص اور پسماندہ دنیا کو بحیثیتِ مجموعی خودشناسی اور عرفانِ ذات کا سبق دیا اور اسلام کے انقلابی فکر سے روشناس کرایا۔ دُوسری طرف ترقی یافتہ یا متموّل ممالک کو بھی تنبیہہ کی کہ اگر اُنھوں نے انسانیّت میں تفریق روا رکھی اور اپنا رویّہ نہ بدلا تو ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ انسانی ذہن کی منفرد اور تخلیقی و اختراعی صلاحیّت اور اس کے فروغ کے لیے تعلیمی و تربیتی ذرائع کی تنظیم، اپنے وسائل کا پُورے طور پر استعمال، اپنی پیداوار میں اضافہ، معاشی بہبود کے لیے اپنی صنعت و حرفت پر انحصار، سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی نظام کا حیاتِ انسانی کے لیے ناکافی اور مضر ہونا، انسان کے اپنی تقدیر پر قادر ہونے کی

old: 04713

ضرورت ، اخلاقی قدروں پر اس کے عمل کی بنیاد ، مسلسل تخلیقی جدوجہد وغیرہ ——— اقبال کے ان سب نظریات کا عکس آج کے آزاد خیال مفکّروں کی تصانیف میں دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ آج نئے انداز میں وہی کہہ رہے ہیں جو اقبال نے پچاس سال پیشتر کہا تھا۔ پس اگر ہم اپنے اندر اتّحاد پیدا کریں اور صحیح معنوں میں اقبال کے پیغام کو سمجھیں، تو دُنیائے اسلام اپنے کردار و عمل سے پسماندہ دُنیا میں ایک نئی رُوح پھُونک سکتی ہے اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرا کے اُسے عالمِ انسانیّت کی امامت کے قابل بنا سکتی ہے۔

مولانا کوثر نیازی اپنے مقالے کے آخر میں اقبال کی قلندرانہ بلکہ مجذوبانہ بصیرت کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں :

"آنے والی صدی یعنی اکیسویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہے۔ یہ میرا ایقان ہے، یہ میرا ایمان ہے۔ اس لیے کہ زمانہ اب سارے دروازوں پر دستک

دے چکا، دیکھ چکا۔ ہر سراب کی
طرف پانی کی تلاش میں لپک کر
جا چکا۔ آخر کار اُسے روح کی پیاس
بجھانے کے لیے اسلام کے چشمۂ صافی
کی طرف آنا ہو گا..... یہ محض
ہماری خوش فہمی نہیں ہے..... یہ
کلامِ اقبال سے مستند نظر کی بازیافت
اور دریافت ہے اور ہر قاری اور
طالب علم جانتا ہے کہ اقبال نے دنیائے
انسانیت کے احوال کو دیکھنے کے بعد یہ
یقین کیا تھا کہ دُنیائے انسانیت آخر کار
اسلام کے دروازے پر آئے گی.....
اگر مَیں نے یہ کہا ہے کہ اکیسویں صدی
غلبۂ اسلام کی صدی ہے تو یہ حقیقتاً مَیں
نے نہیں کہا بلکہ اقبال کے کلام کی ہی
مَیں نے تشریح کی تھی۔"

ظاہر ہے مولانا کوثر نیازی نے ان جذبات کا

اظہار اقبال کی رجائیت کے جبر سے متاثر ہو کر کیا ہے۔
اقبال کی رجائیت کے جبر کا اثر بالخصوص ہر حسّاس اور دردمند مُسلمان کے دل پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اقبال دلوں کا شکاری ہے۔ زمانے کا اسلام کی طرف آنا تو ہر مُسلمان کی رُوحانی آرزو ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عصرِ حاضر کے مسلمان نے اسلام کے سوا ہر دروازے کو کھٹکھٹایا، لیکن پشیمانی کے علاوہ اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اگر منزل ہی سرکتی رہی ہو تو قدم کیوں کر سنبھل سکتے ہیں۔ بالآخر اُسے اپنی بقا کی خاطر بہ عالمِ مجبوری اسلام کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اقبال نے "رجائیت کے جبر" کو "خودی کی قاہری" کا نام بھی دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ سب عشق و مستی کی کیفیات ہیں۔

ارشاد کرتے ہیں ؎

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوّتوں کا عیار
اِسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سُبحانی

یہ جبر و قہر نہیں ہے عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی !
کیا گیا ہے غلامی میں مُبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی !
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مُسلمانی

جاوید اقبال

اراکینِ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، مہمانانِ مکرّم،

خواتین و حضرات!

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج اسلام آباد میں پہلی مرتبہ پاکستان کے عظیم فلسفی شاعر عالمِ اسلام کے ایک انقلابی دانشور اور تیسری دنیا کے ایک عظیم رہنما کے حضور خراجِ عقیدت پیش کرنے کی اس تقریب میں اپنے صدارتی کلمات کہہ رہا ہوں۔

مَیں نے ان کلمات میں جان بُوجھ کر تیسری دُنیا کے الفاظ استعمال کیے ہیں اس لیے کہ آج کل جو اصطلاحات خاص طور پر رائج ہیں اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان میں سے تیسری دنیا کی اصطلاح بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ مگر جیسا کہ چند گنے چُنے لوگوں کے سوا کوئی ان باقی اصطلاحوں کے بارے میں نہیں جانتا ہے کہ اِن سے مراد کیا ہے۔ ویسے ہی یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تیسری دُنیا کی اصطلاح سے مراد کیا ہے اور آج مَیں نے اقبال کو تیسری دُنیا کا ایک انقلابی مفکّر کن معنوں میں کہا ہے۔

حضرات! اقبال کے زمانے میں یہ اصطلاح موجود نہ تھی۔ یہ اصطلاح پہلے مشرق اور مغرب کی اصطلاح تھی۔ مغرب کی سائنسی، تعلیمی، اقتصادی، تہذیبی ترقی ایک طرف تھی اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ عوام کی جہالت اور ان کی اقتصادی اور تہذیبی مغلوبیّت دوسری طرف تھی اور اس طرح مشرق اور مغرب کا باہم موازنہ ہوتا تھا۔ بعد میں جب کمیونسٹ انقلاب برپا ہُوا

تو دنیا تین حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک صرف مغربی یورپ اور وہ مُلک جہاں سرمایہ دارانہ نظام جاری تھا۔ دوسری طرف مشرقی یورپ اور کمیونسٹ ملک اور تیسری طرف ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے وہ ممالک کہ جو ترقی پذیر تھے اور جو اوّل الذکر دونوں کیمپوں میں شامل نہ تھے۔ یہی وہ کیمپ ہے جس کو تیسری دُنیا کہا جاتا ہے۔ تیسری دُنیا کے ممالک اسی کیمپ میں شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے جب پسماندہ اقوام کو دعوتِ فکر دی ہے اور ان کے نام اپنا پیغام دیا ہے تو جیسا کہ مَیں نے کہا اس وقت یہ تھرڈ ورلڈ اور تیسری دُنیا کے الفاظ موجود نہ تھے اور اس کا وجود بھی نہ تھا لیکن اقبال نے اقوامِ مشرق کو خاص طور پر اپنی گفتگو کا مخاطب بنایا اور ان کے کلام میں اکثر و بیشتر جو مضمون پیش کیے گئے ہیں وہ مغرب پر تنقید، اس کی ظاہری ملمع کاری پر تنقید، اور اس ملمع کاری کا پردہ چاک کرنے سے متعلق ہیں۔ ان میں مشرقی اقوام کے نام وہ بیداری کا پیغام ہے جو آج حقیقت میں ہر انقلاب کی اساس اور بنیاد بن

سکتا ہے۔ جب علامہ اقبال نے اپنی کتاب مثنوی اسرارِ خودی لکھی تو اس کے چھپنے کے ایک سال بعد روس کا انقلاب آیا۔ اس لیے کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کسی انقلاب سے متاثر ہو کر لوگوں کے سامنے اپنا پیغام پیش کر رہا تھا اور اقبال نے اگر خودی کے نام سے پیغام پیش کیا ہے تو وہ صرف فرد کے لیے ہی نہیں ہے۔ قوموں کے لیے بھی ہے۔ جب وہ قوموں کے لیے خودی پر زور دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قومیں اپنے آپ کو پہچانیں۔ اپنے ماضی کے ورثے سے آگاہ ہوں۔ اپنی زمین میں مدفون معدنیات کو جانیں کہ کیا ہیں۔ اپنی عسکری طاقت کو بڑھائیں۔ اپنے علوم کی حدود کو اور وسعت دیں۔ سائنس میں کمال حاصل کریں، اور دوسروں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنے آپ میں اعتماد پیدا کریں۔ یہ خودی کا وہ پیغام ہے۔ جو قوموں کے نام اقبال کے کلام میں موجود ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں جب کہ مسئلہ فلسطین پیدا ہوا اور یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ چونکہ یہ شروع میں ہمارا وطن تھا اس لیے اس پر

ہمارا حق ہے تو اقبال نے اس دعوے کی تغلیط اور تردید کرتے ہوتے عربوں کو اس مسئلہ کے حل کی جو شاہ کلید دی وہ یہی خودی تھی۔ اس نے کہا کہ تمھارے مسئلہ کا حل نہ یو این او میں ہے نہ جینوا میں ہے نہ کسی اور جگہ ہے صرف عرفانِ ذات میں ہے۔ صرف اپنی مخفی قوتوں کے احساس اور پہچان میں ہے۔ وہ صرف اپنی ذاتی طاقت پر اعتماد کرنے میں ہے اور جملہ معترضہ کے طور پر میں یہ بھی کہتا چلوں کہ علامہ اقبال نے بڑے دل چسپ انداز میں یہود کے اس دعوے کی تغلیط کی کہ چونکہ ہم کبھی اس سرزمین میں رہے ہیں اس لیے یہ ہمارا وطن ہے (فلسطین سے کبھی ہم نکلے تھے نکالے نہیں گئے تھے یہ بھی ایک تاریخی بحث ہے کہ نکالے نہیں گئے تھے بلکہ خود نکلے تھے۔ مگر انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا وطن ہے) اقبال نے جس انداز سے اس دلیل کو رَد کیا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہودیوں کا دعوے بھی بڑا عجیب ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ریڈ انڈین یہ دعوے کر دیں کہ امریکہ اصل میں ہمارا وطن ہے۔ اسی

طرح اگر گاتھ اور گال یہ دعوے کر دیں کہ برطانیہ ہمارا وطن ہے اور ہندوستان کی آرین اقوام یہ دعوے کر دیں کہ رُوس ہمارا وطن ہے اور ایران ہمارا وطن ہے اس لیے کہ ان ملکوں سے ان قوموں کا کبھی نہ کبھی تعلق رہا ہے ـــــ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا نکتۂ زیرِ بحث یہ تھا کہ اقبال نے خودی میں کس طرح قوموں کے نام اور اقوامِ مشرق کے نام اور پسماندہ قوموں کے اور تیسری دُنیا کے نام پیغام دیا۔ اس سلسلے میں مَیں یہ دو بند پیش کروں گا۔ پہلے اس دعوے کی تردید کے ضمن میں اقبال کے یہ شعر کہ

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

ہسپانیہ میں بھی تو اہلِ عرب بستے تھے۔ وہاں انھوں نے سات سو سال تک حکومت کی ہے۔

اور پھر عالمِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں : ؎

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
مَیں جانتا ہُوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہُود میں ہے
سُنا ہے مَیں نے غلامی سے اُمّتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

دوسرا بڑا مسئلہ جو اس وقت تیسری دنیا کے پسماندہ ملکوں کو لاحق تھا اور آج بھی لاحق ہے وہ ان کی حالتِ فقر و فاقہ، ان کی بھُوک ان کی احتیاج اور ان کی حاجت مندی ہے۔ اقبال نے جب اپنی مشہُور مثنوی :

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

لکھی تو حقیقت میں اس کتاب میں، اس مثنوی میں انھوں نے اُنہی پسماندہ اقوام سے خطاب کیا ہے اور اس میں انھوں نے ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہُوئے احتیاج کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ چیز جو شیروں کو لُومڑی بنا دیتی ہے۔ وہ یہی احتیاج ہے۔ جب انسان بھُوک میں مبتلا ہوتا ہے۔ جب اُس کو

کوئی احتیاج لاحق ہوتی ہے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے سرکس کا شیر ہوتا ہے۔ کون سی چیز آخر اس کو ماسٹر کے اشارے پر رقص کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی بھوک ہی تو ہوتی ہے۔ جب اس کو بھوکا رکھتے ہیں تو بے حد بھوک کے بعد وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ ماسٹر کے اشارے پر رقص کرے کیونکہ اس کو خوراک صرف اس وقت ملتی ہے جب وہ ماسٹر کے اشارے پر ناچتا ہے۔

اقبال نے کہا ؎

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

شیروں کو بھی جو چیز روباہ مزاجی پر مجبور کر دیتی ہے وہ احتیاج ہے اس لیے اقوامِ شرق اگر انگریز کے غلبے سے نکلنا چاہتی ہیں، سامراج کے غلبے سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں اور ترقی یافتہ قوموں کے تسلّط سے آزاد ہونا چاہتی ہیں تو اس کا پہلا رستہ یہ ہے کہ انھیں احتیاج کے پھندے توڑنے چاہئیں

اپنی بھوک کا علاج کرنا چاہیئے۔ انھیں اپنے فقر و فاقہ کا علاج کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہی وہ احتیاج ہے جو ان کو ان اقوام کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ان کی عزّتِ نفس کو اُن سے چھین لیتی ہے۔ احتیاج کے بعد دُوسری بیماری جس کا علاّمہ نے خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ وہ استحصال ہے۔ بدقسمتی سے استحصال بھی ایسا لفظ ہے جو اب فیشن کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور مَیں رات دن اِسے اخباروں میں پڑھتا ہُوں خود استحصال کرنیوالا طبقہ بھی استحصال کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن تیسری دُنیا کی اصطلاح کی طرح بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ استحصال کے معنی کیا ہیں۔ آپ کہیں کہ استحصال کسے کہتے ہیں تو انگریزی پڑھے لکھے لوگ فوراً EXPLOITATION کہہ دیں گے، اور جو اُردو دان ہیں وہ کہیں گے کہ استحصال تو استحصال ہی ہوتا ہے۔ اصل میں صحیح راستے سے کسی چیز کو حاصل کیا جائے تو وہ اس کا حصُول ہوتا ہے لیکن اگر ظلم کے رستے سے اور احتیاج کو EXPLOIT کر کے کسی چیز کو حاصل کیا جائے تو اس کو استحصال کہتے ہیں۔ یہ بھی حاصل کرنا ہے مگر

اس میں زبردستی کا پہلو پایا جاتا ہے اور عربی دان جانتے ہیں کہ یہ لفظ جس باب سے نکلا ہے اس کے خاصے میں یہ بات شامل ہے اور اس باب میں جتنے الفاظ ہیں وہ سب اسی طرح سے معنی دیتے ہیں تو علامہ اقبال نے خاص طور پر استحصال کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح دوسری قومیں ان پسماندہ اقوام کا استحصال کر رہی ہیں۔ پھر بتایا کہ ان قوموں نے پسماندہ ملکوں کو منڈی بنا رکھا ہے۔ ان قوموں نے پسماندہ ملکوں کو لقمۂ تر سمجھ رکھا ہے اور پسماندہ قوموں کی آنکھوں پر کیسی پٹی بندھی ہوئی ہے کہ وہ ہمارے ہی MATERIAL سے قالین بنتے ہیں اور پھر ہماری ہی منڈی میں آکر فروخت کرتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ہم ان کے قالین یعنی فرنگی قالین حاصل کر رہے ہیں اور اپنے گھروں میں بچھا رہے ہیں۔ وہ ہمارا ہی خون نچوڑ کر شراب ناب تیار کرتے ہیں اور پھر ہماری ہی محفلوں میں اس کے جام چلتے ہیں۔ وہ ہماری ہی دولت سے ہمارے خون پسینہ کی کمائی سے لباس تیار کرتے ہیں اور ہم غیر ملکی لباس پہن کر اُن کی منڈیوں میں تیار ہونے والا لباس پہن کر یہ سمجھتے ہیں

کہ اُن کی مشینوں کا بنا ہُوا لباس شاید ہمارے لباس سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور کہیں زیادہ ارفع ہے۔ اقبال نے جو انقلابی پیغام دیا ہے اور استحصال کے پنجے سے نکلنے کے لیے جس طرح انھوں نے اپنی مصنوعات کو رواج دینے اور اپنی بنائی ہوئی چیزیں استعمال کرنے پر زور دیا ہے شاید بہت کم لوگ اُس سے آگاہ ہیں۔ مَیں آپ کے سامنے مثنوی :

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"

سے دو چار شعر پیش کرتا ہوں جس میں علّامہ اقبال مرحوم نے خاص طور پر ذکر کیا ہے اس مضمون کا جو اس وقت موضوعِ بحث ہے کہ ؎

بے نیاز از کار گاہِ اُو گزر
در زمستاں پوستینِ اُو مخر

اس کی بنائی ہوئی پوستین اس کا بنایا ہُوا کوٹ اس کا بنایا ہُوا اوور کوٹ سردی میں نہ خرید۔

اور اے قومِ مشرق :

کشتنِ بے حرب وضرب آئینِ اُوست
مرگہا در گردشِ ماشینِ اُوست

یعنی۔ اس کی مشین کی گردش میں تیری موت چھپی ہُوئی ہے۔

بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ

اور پھر کہا :

آنچہ از خاک تو رُست اے مردِ حُر
جو چیز تیری زمین سے اُگتی ہے
اے مردِ آزاد !
آنچہ از خاک تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش وآں بپوش وآں بخور

وہی بیچ وہی پہن وہی کھا جو خود تیری زمین سے اُگتا ہے۔

اور وہ افراد اور وہ اقوام جو عرفانِ ذات اور خودی کی دولت سے مالا مال ہیں — وہ گدڑی خود بُنتے ہیں (دوسروں کے قیمتی لباس کی طرف نہیں دیکھتے)۔

آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیم خویش را بافیدہ اند

یہ اقبال کا پیغام ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ استحصال کا خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح اقوامِ مغرب نے اور کس طرح ترقی یافتہ اقوام نے پسماندہ اقوام کا اور تیسری دنیا کی اقوام کا استحصال کیا ہے۔ پھر تیسری دنیا کے نام اپنے پیغام میں خاص طور پر اقبال جس بات کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ تہذیبِ مغرب کی نقالی کا انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ غیروں کے چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی زبان کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کو خیرباد کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقبال سے زیادہ مغرب کا اداشناس کون تھا۔ ہمارے ہاں تو لوگ مغرب میں چند دن گزارنے کے بعد بہک جاتے ہیں۔ چند گھونٹ مغرب کے جام سے پینے کے بعد اُن کے ہوش و حواس قائم نہیں

نہیں رہتے، لیکن اقبال نے تو سمندر کے سمندر پی رکھے ہیں
اقبال نے تو نو دس سال وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ یورپ کو
قریب سے دیکھا، برتا اور جانچا ہے، بڑے
بڑے مغربی اسکالرز سے براہ راست ان کے فلسفوں کو سمجھا ہے۔
اس کے باوجود اقبال نے ایک نقاد کا انداز اختیار کیا۔
ایک نقال کا انداز اختیار نہیں کیا اور اقبال نے یہ محسوس
کیا یہ بتایا اور ان کی ساری کتابیں اِس بات کی
شاہدِ عادل ہیں کہ یہ تہذیبِ مغرب جو آج تمھیں بہت
دل فریب نظر آ رہی ہے جس کی روشنی سے تمھاری آنکھیں
خیرہ ہو رہی ہیں اس کی مثال اس چُونا گچ قبر کی مانند ہے
جس کے اُوپر سفیدی پھری ہوئی ہے لیکن جس کے اندر
مُردے کی سڑاند موجود ہے۔ اقبال نے ان لوگوں کو
جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے اور مجھے خیال آتا ہے کہ شاید
وہ ہماری ہی سوسائٹی کے بعض نام نہاد دانشور اور مفکّر
ہیں۔ وہ لوگ کہ جنھیں اس چُوہے کی طرح جسے ہلدی کی
ایک گانٹھ مل گئی تھی اور اُس نے پنساری کی دکان
کھول لی تھی۔ ایسے ہی ان لوگوں کو مغرب سے چند

باتیں مل گئی ہیں اور آج یہ سب سے بڑے دانشور بن گئے ہیں۔ اقبال نے ان لوگوں کو جگہ جگہ لتاڑا۔ ان لوگوں کو جگہ جگہ جھنجوڑا اور تہذیبِ مغرب سے جن لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہیں، ان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اُتارے۔ اُس نے دیکھا کہ تہذیبِ مغرب ظاہری روشنی کے باوجود، چکاچوند کے باوجود فنا پذیر ہے، زوال پذیر ہے۔ ختم ہوا چاہتی ہے اور یہ اس شعلے کی بھڑک ہے جو چراغ کے اندر اس وقت بھڑکتا ہے جب چراغ گُل ہونے کو ہوتا ہے۔

اقبال کے یہ اشعار اس مضمون میں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ وہ کہتا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

اور اقبال نے کہا ہے ؎

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جُوئے خوں ہے یہ جُوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عُریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ

اور پھر ان لوگوں کے الفاظ کے جواب میں جو کہتے ہیں کہ پانی بھی مسخّر کر لیا مغرب نے اور ترقی یافتہ اقوام نے ہوا کو بھی مسخّر کر لیا، تو تہذیبِ مغرب کا جنازہ کیسے اُٹھے گا۔ کیسے یہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ اقوام موت کے گھاٹ اُتاری جائیں گی اور ان کا سفینہ غرق ہو گا۔ اقبال اپنی پیش بینی اور مستقبل رسی سے کام لیتے ہُوئے کہتے ہیں اور حقیقت میں یہ ان کی ایک مومنانہ بصیرت ہے، قلندرانہ بصیرت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ مَیں اس کے لیے دلیل نہیں دیتا، مگر مَیں تم سے کہتا

ہُوں ٹھیک ہے ؎

پانی بھی مسخّر ہے ہوا بھی ہے مسخّر
کیا ہو جو نگاہِ فلک پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

اور پھر مغرب کے رہنے والوں کو کہا کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہو گا

اقبال صرف تہذیبِ مغرب سے ہمیں متنفّر نہیں کرتے۔ ہمیں اس سے بے گانہ نہیں بناتے۔ اس کی اچھائیوں کی طرف ہمیں دعوت بھی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے اچھے پہلوؤں کو حاصل کرو۔ اس لیے کہ وہ ہماری متاعِ گم گشتہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ جب وہ تہذیبِ مغرب کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ ختم ہوا چاہتی ہے اور اب وہ اپنا

جنازہ خود اٹھائے ہوئے ہے اور وہ برف کی طرح لمحہ بہ لمحہ پگھلتی چلی جا رہی ہے تو ساتھ وہ رجائیت کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ وہ امید کے پیغامبر بھی بنتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب کے ختم ہونے سے دنیا ختم نہیں ہو گی، انسانیّت ختم نہیں ہو گی۔ ایک نئی سحر طلوع ہو گی، ایک نیا فردا سامنے آئے گا ایک نیا کل سامنے آئے گا اور انسانیّت ایک نئے مستقبل سے، ایک روشن مستقبل سے روشناس ہو گی۔ اس کو نیا مستقبل ملے گا۔ کس طرح ملے گا؟ مَیں آگے اس کا ذکر کروں گا۔ لیکن آپ اقبال کی رجائیت کا یہ پہلو دیکھیے کہ اس نے کس طرح وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کے حالات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ آج یہ تہذیب ختم ہونے کو ہے اور نیا انقلاب جنم لے رہا ہے اور جو باتیں اس وقت اقبال نے کہیں وہ آج پُوری ہو رہی ہیں۔ اقبال نے کہا تھا :

- زمانے کے انداز بدلے گئے
  نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

- ہُوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
- پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
- گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

اور یہ بند سُنیئے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اِس قدر ہوگی تمنّا آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لیکن یہاں تک مَیں نے یہ بات کی ہے کہ علاّمہ اقبال تیسری دنیا کے عظیم مفکّر ہیں، تیسری دنیا کے امراض کی نشان دہی کرتے ہیں اور ترقی یافتہ مغرب کے زوال کی بات بتاتے ہیں ان کی تہذیب کے کمزور گوشوں سے نقاب اُٹھاتے ہیں۔ ہماری عظمتِ رفتہ کی ادائیں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ہمیں عرفانِ ذات سے رُوشناس کراتے ہیں۔ ہمیں جذبۂ خودشناسی دیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات جس میں اقبال دوسرے تمام مفکّروں سے نمایاں ممیّز اور ممتاز ہیں وہ یہ ہے کہ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ فقط منفی بنیاد کوئی بنیاد نہیں۔ محض نفرت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، محض مغرب سے اور سرمایہ داری نظام سے اور محض جو قومیں استحصال کر رہی ہیں اُن کے ظلم سے بیگانگی یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں ہے جس پہ اقوامِ مشرق متحد ہو سکیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ صرف لا کوئی بات نہیں۔ یہ NEGATIVE بات ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر

تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ ہر تعمیر سے پہلے پُرانی بنیادیں ڈھا کے نئی بنیاد بنانی پڑتی ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ محض ڈھانا کوئی بات نہیں ہے۔ محض نفی کرنا کوئی بات نہیں ہے۔ محض لا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لا کے بعد الّا کی بھی ضرورت ہے۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی ضرورت ہے۔ نیگیٹو (NEGATIVE) کے بعد پازیٹو (POSITIVE) کی بھی ضرورت ہے۔ اس بات کو اقبال نے اپنے کلام میں کس طرح پیش کیا ہے۔ آئیے آپ دیکھیے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ قومیں جو کامیاب ہوئی ہیں آج۔ چین اور روس میں انقلاب لانے والوں اور سرمایہ داری کو ختم کرنے والوں اور سرمایہ داری کے پُرانے بُت توڑنے والوں میں کمی کیا ہے؟ وہ کمی یہ ہے کہ وہ صرف ڈھا دینے کی حد تک، انسانی برادری کے اندر جو بُت بنے تھے ان کو چکنا چُور کرنے کی حد تک، ایک قوم اور ملک کے اندر جو استحصالی طاقتیں تھیں ان کو ختم کرنے کی حد تک تو درست ہیں، لیکن انسان صرف پیٹ ہی کا نام تو نہیں ہے۔ انسان رُوح کے

تقاضے بھی تو رکھتا ہے۔ اب اس کے لیے لا سے آگے اِلّا کی ضرورت ہے۔ نفی سے آگے اثبات کی ضرورت ہے۔

اقبال کہتا ہے :

نکتۂ می گویم از مردانِ حال
اُمّتاں را لا جلال اِلّا جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات
لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

اور روس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے :

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

نفی کی منزل پہ وہ آگے بڑھا اُس نے بُت ڈھا دیے۔ چکنا چُور کر دیے۔ انقلاب آیا۔ سرمایہ داری ختم ہُوئی ؎

آں نظامِ کہنہ را برہم زدست
تیز نیشے بر رگِ عالم زدست

ٹھیک ہے مگر ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

مَیں نے اس کے مقامات کو دیکھا ہے

لا سلاطیں لا کلیسا لا اِلٰہ

نہ وہاں سلاطین ہیں ، نہ وہاں

کلیسا ہیں ۔ مگر اسی کے ساتھ خدائے

برحق بھی نہیں ہے۔

تو کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے ؎

فکرِ اُو در تُند بادِ لا بماند

مرکبِ خود را سوئے اِلّا نہ راند

اس کی کمی یہ ہے کہ وہ لا کی حد

تک رہا اور اِلّا کی طرف آگے

قدم نہ بڑھایا۔

اقبال یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ اقوامِ مشرق کے لیے اتحاد کی مثبت بنیادیں درکار ہیں POSITIVE بنیادیں درکار ہیں اور وہ POSITIVE بنیادیں کیسی ہیں اور کون دے سکتا ہے۔ ایک ایسا نظام ، ایک ایسی تعلیم ، ایک ایسا اصول جس میں رنگ اور نسل اور

جغرافیائی حدود کے خرخشے نہ ہوں۔ جس میں قوم پرستی نہ ہو، جس میں جغرافیائی حدیں انسان کو انسان سے اس طرح دُور نہ کر دیں کہ وہ ایک دُوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ جس میں سرمایہ دارانہ استحصال کا خاتمہ ہو۔ جو جسمانی احتیاج کو بھی ختم کرے اور روحانی احتیاج کو بھی ختم کرے۔ ایسا نظام کون سا ہو سکتا ہے۔ ایسا اصُول کون سا ہو سکتا ہے۔ ایسی تعلیمات کہاں سے مل سکتی ہیں۔ پروفیسر نِکلسن کے جواب میں اقبال نے کہا کہ مَیں نے ساری دنیا کے نظاموں پر نظر ڈال کر، ساری دنیا کے اصُولوں پر، تعلیمات پر نگاہ ڈال کر اور ناقدانہ جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر ایسا نظام کِسی کے پاس ہے کہ جو لا اور اِلّا دونوں کی ضرورتوں کو پُورا کرتا ہے جو پیٹ اور روح دونوں کی ضرورتوں کو پُورا کرتا ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔

مگر دوستو! کون سا اسلام؟ کیا شیعوں کا اسلام؟

سُنّیوں کا اسلام ؟ وہ اسلام جو محض بریلی میں بند ہے ؟ وہ اسلام جو دیوبند کی چار دیواری میں محبوس ہے ؟ وہ اسلام جس میں ایک بھائی کے ہاتھ دُوسرے بھائی کے گریبان پر اُٹھتے ہیں ؟ وہ اسلام کہ جس میں ایک دوسرے کے لیے کُفر کے فتوے ہیں ؟ وہ اسلام جس میں محض اسلام کی اجارہ داری اپنے گروہوں کے اندر محدُود کر دی گئی ہے ؟ وہ اسلام کہ جس کے اندر زمانے کے ارتقاء کے ساتھ قدم زن ہونے کی ہمّت اور صلاحیّت اور مُجتہدانہ بصیرت مفقود ہے ؟ نہیں وہ اسلام نہیں بلکہ وہ اسلام جو محمدؐ عربی کا اسلام ہے۔

وہ اسلام کہ جو اس خدا نے اتارا ہے۔ جس نے وقت کو پیدا کیا ہے اور جانتا ہے کہ وقت کے تقاضے کیا ہیں۔ اس نے وہ دین دیا جو وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلتا ہے۔ جو وقت کے تقاضوں کو اپنے ساتھ چلاتا ہے۔ اگر ہم تیسری دُنیا کو

اقبال کی فکر سے روشناس کرا سکتے ہیں تو ہمیں پہلے فرقہ بندی سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ ہمیں پہلے بریلوی، دیوبندی، شیعہ، سُنّی۔ ان تنازعات سے اُوپر اُٹھنا ہوگا۔ ہمیں گروہی اور سیاسی اور حزبی تعصّبات سے بالاتر ہونا پڑے گا۔ ہمیں پہلے اپنے دلوں کے اندر فراخی پیدا کرنی ہوگی۔ اتنی جتنی مسجدِ قرطبہ میں ہے، اتنی جتنی بادشاہی مسجد میں ہے، اتنی جتنی دریائے فرات میں ہے، اتنی جتنی راوی اور سندھ میں ہے۔ اس کے بعد ہم تیسری دُنیا کو اسلام کا وہ پیغام دے سکتے ہیں جس کی تعلیمات کی بازگشت اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ آج خوشی کی بات ہے کہ تیسری دنیا میں عرب اور ایران کی دولت ہے۔ عرب اور ایران کا تیل ہے۔ آج تیسری دنیا میں پاکستان کی MANPOWER پاکستان کی افرادی طاقت ہے۔ آج تیسری دُنیا میں ایمان کی دولت سے مالا مال انقلابی مسلمان رہنما ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تیسری دُنیا اپنے گھروندوں کو توڑ کر دُنیائے انسانیت کی امامت

کرسکتی ہے۔ وہ استحصال سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔ وہ احتیاج سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔ وہ ان تمام بیماریوں کا علاج کرسکتی ہے جو اس کے بدن کو، جو اس کی روح کو صدیوں سے لاحق ہیں اور جس کے لیے آج زمانہ شور کر رہا ہے اور جس کا شافی علاج ہمارے ملّی اور قومی شاعر علامہ اقبال نے دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اتحاد پیدا کریں۔ ہم اسلام کی انقلابی فکر سے اپنی نگاہوں کو روشن کریں اور ان لوگوں کو ہم ناکام بنادیں جو پاکستان میں فکرِ اقبال کو توڑ مروڑ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میری مراد فکرِ اقبال کے ان مجاوروں سے ہے جو کہتے ہیں کہ اقبال محض ایک عام انقلابی شاعر تھا۔ لیکن انھیں معلوم نہیں ہے کہ اُس کے انقلاب کا سرچشمہ اسلام کی تعلیمات میں ہے۔ اسی لیے اس نے ملّتِ اسلامیہ کو جگہ جگہ خطاب کیا ہے۔ اسی لیے اس نے عالمِ عرب کو خطاب کیا ہے۔ اور عالمِ عرب کو یہ بھی بتایا ہے کہ ع

محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

کہ عالمِ عربی کا وجود اگر مشخّص ہوتا ہے، معیّن ہوتا ہے تو محمدؐ عربی سے ہوتا ہے۔ بولہب اور بوجہل سے نہیں ہوتا ہے۔ عرب قوموں کے مسائل کا علاج یہی ہے۔ اس نے کہا کہ عالمِ عرب کا وجود اگر مشخّص کرنا ہے تو محمدؐ عربی سے مشخّص کرو۔ اسی لیے اس نے عالمِ عرب کو دعوت دی۔ اسی لیے ملّتِ اسلامیہ کو پکارا۔ کیونکہ اس کے نزدیک مسلمان ہی وہ قوم ہے، عرب ہی وہ قوم ہیں، ملّتِ اسلامیہ ہی وہ ملّت ہے کہ جو تیسری دُنیا کے مسائل کا علاج کرنے کے بعد دنیائے انسانیّت کے سامنے فکر و نظر کے چراغ روشن کر سکتی ہے۔ مَیں نے لاہور میں کہا تھا کہ آنے والی صدی یعنی اکیسویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہے۔ یہ میرا ایقان یہ میرا ایمان ہے اس لیے کہ زمانہ اب سارے دروازوں پر دستک دے چکا، دیکھ چکا۔ ہر سراب کی طرف پانی کی تلاش میں لپک کے جا چکا۔ آخر کار اسے رُوح کی پیاس بجھانے کے لیے اسلام کے چشمۂ صافی کی طرف آنا ہوگا۔ اس پر ایک دوست نے، ایک ایڈیٹر نے ایک مفکّر نے ایک بزرگ دانشور نے ایک مفسّرِ قرآن نے ایک صاحبِ قرآن نے اور اقبال کے ایک زبردست شیدائی نے

اپنے رسالے میں بہت پھبتیاں کسی ہیں اور کہا ہے کہ یہ پیشگوئی بڑی عجیب پیشگوئی ہے۔ یہ تو محض خوش فہمی کی بات ہے اور میں اُن کا نام بھی نہیں لیتا۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے طلوع کا وقت ہے غروب کا وقت نہیں ہے مگر کچھ لوگ شاید اسلام کے طلوع سے زیادہ اس کے غروب میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں اُن کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ محض ہماری خوش فہمی نہیں ہے یہ اقبال کے کلام سے مستنیر نظر کی بازیافت اور دریافت ہے اور اقبال کا ہر قاری اور طالب علم جانتا ہے کہ اقبال نے دنیائے انسانیت کے احوال کو دیکھنے کے بعد یہ یقین کیا تھا کہ دنیائے انسانیت آخر کار اسلام کے دروازے پر آئے گی اور اب وہ وقت آگیا ہے۔ جب کوئی چیز CLIMAX پر پہنچتی ہے تو اس کا ANTI-CLIMAX شروع ہوتا ہے۔ جب حبس بڑھ جاتا ہے تو بارانِ رحمت کی نوید آتی ہے۔ جب خزاں اپنے عروج کو پہنچتی ہے تو بہار کی آمد آمد ہوتی ہے۔ جب اندھیرا آخر پہ پہنچتا ہے تو پھر سورج کی کرنوں کے نمودار ہونے کا وقت آتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے یہ اس کا آئین ہے۔ اگر میں نے یہ کہا ہے کہ اکیسویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہے تو یہ حقیقتاً میں نے نہیں کہا بلکہ اقبال کے کلام ہی کی

میں نے تشریح کی تھی اور اقبال نے کہا ہے۔ یہ اس کا کلام ہے اور اسی پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ یہ رجائیت بھرا پیغام یہ امید بھرا پیغام اقبال نے یقیناً اسی آنے والی صدی کے بارے میں دیا ہے کہ ؎

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مُسلماں کو مُسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

old: 04713

کی وسعتوں کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا کوثر نیازی جنھیں پاکستان میں معاشی انصاف اور اقتصادی برابری پر مبنی نظام کی داعی انقلابی تحریک کے ہراول دستہ میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے ایک انقلابی دانشور ادیب اور سیاست دان ہیں اور فکرِ اقبال کے پُر جوش منبع کی حیثیت سے تیسری دُنیا کے بارے میں اُن کی یہ تحقیق فکر کی دعوت دیتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کی فکری ہمہ گیریت اقوامِ مشرق کے لیے اپنے اندر انقلاب آفریں پیغام لیے ہوئے ہے اور آج تیسری دُنیا کے اتحاد اور استحصالی قوتوں سے نجات کے لیے تیسری دُنیا کی جدوجہد درحقیقت فکرِ اقبال ہی کا ثمر ہے مولانا کوثر نیازی نے فکرِ اقبال کی روشنی میں 'اقبال اور تیسری دُنیا' لکھ کر دُنیائے علم و دانش پر احسان کیا ہے اور پاکستان کی طرف سے تیسری دُنیا کے اتحاد کی حمائت اور جدوجہد میں اس مقالہ سے پاکستانی عوام کو توانائی ملے گی۔

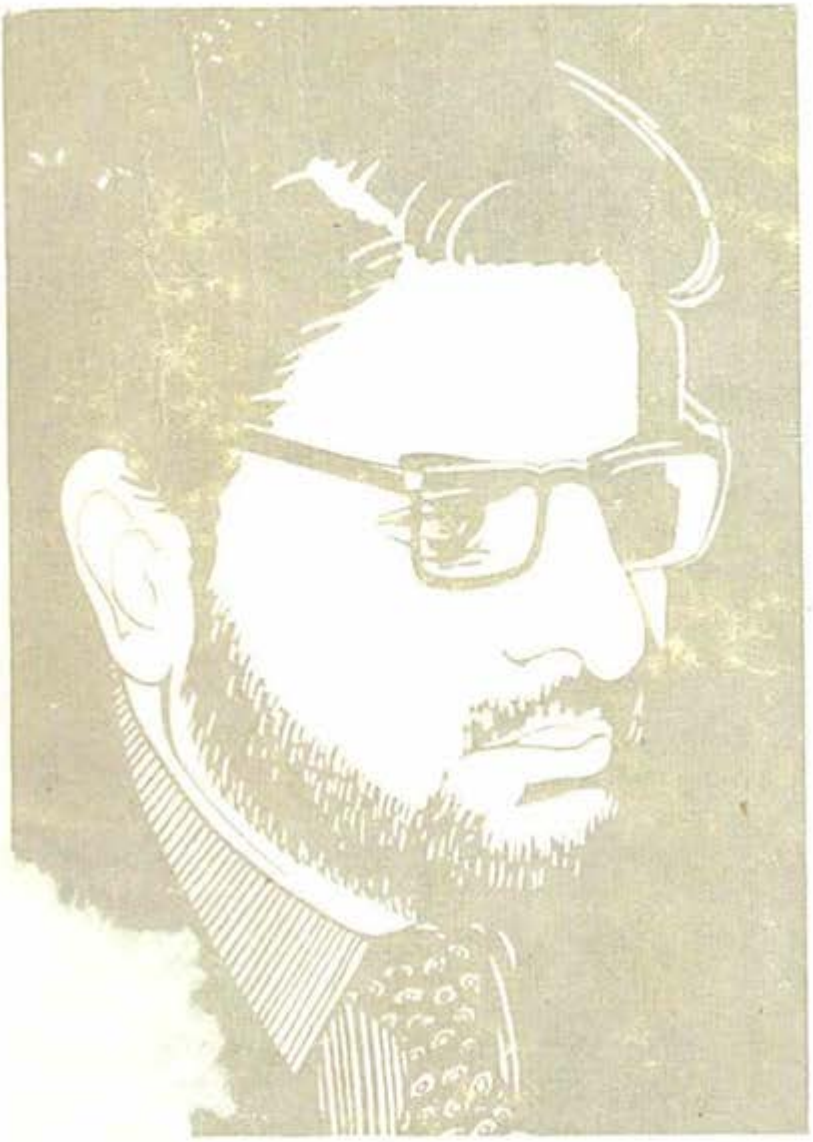

مولانا کوثر نیازی ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ابھی نوجوان طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ
ینگ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو، عربی اور فارسی میں ایم اے کیا۔ زمانہ طالب علمی کے فوراً بعد وہ صحافت سے وابستہ ہو گئے اور لاہور سے
شائع ہونے والے روزنامہ تسنیم اور کوثر کے مدیر رہے۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں شہاب جاری کیا جو عوامی جدوجہد کے زمانے میں پاکستان
میں سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا۔

۱۹۶۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور انھیں پاکستان پیپلز پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا۔

یحییٰ خان کے دور حکومت میں مارشل لا عدالت نے انھیں ان کی تقاریر اور تحریروں کی بنا پر پانچ سال کی سزا دی لیکن [illegible]
[illegible] ابھی وہ پابند سلاسل ہی تھے کہ ایکشن ہوا اور وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ [illegible]
جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو مولانا کوثر نیازی کو ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر کا مشیر برائے اطلاعات و نشریات و اوقاف
مقرر کیا گیا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو انھیں اطلاعات و نشریات کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو وہ پاکستان میں پہلی مرتبہ قائم
ہونے والی وزارت مذہبی امور کے وزیر مقرر ہوئے۔

وہ اردو زبان کی ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کئی کتابوں کا فارسی، انگریزی اور عربی زبان میں بھی ترجمہ
ہو چکا ہے۔ ان کے قلم و زبان سے [illegible] پیغام۔ [illegible] نظام کے لیے [illegible]